گھریلو تشدُّد (روک تھام اور تحفظ) کا بل

Domestic violence (prevention and protection) Bill,2021

مفتی شعیب عالم
استاذِ جامعہ و نائب مفتی دارالافتاء

(ساتویں اور آخری قسط)

بل پر شق وار تبصرے کے بعد اب اس کی چند موٹی موٹی خامیوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

مصالحت کی مخالفت

خاندان کی بنیاد زوجین کے تعلق پر ہے۔ اگر زوجین کے مابین نزاع ہو جائے تو اس کے لیے قرآن کریم میں ''نشوز، شقاق اور اعراض'' وغیرہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور اس کے حل کے لیے مصالحت پر زور دیا گیا ہے۔ قرآن کریم کی یہ مصالحتی تجویز اس کے اصولوں کے ہم آہنگ ہے، کیونکہ جب وہ عائلی زندگی کی بنیاد صلح وصفائی، عفو و درگزر، حسنِ سلوک، صلہ رحمی اور ایثار و ہمدردی پر رکھتا ہے تو ان اُصولوں کا تقاضا بھی مقدمہ بازی نہیں، بلکہ چشم پوشی ہے اور مخاصمت نہیں، بلکہ مصالحت ہے۔ قرآن پاک کی روشنی میں مصالحت میں خیر ہے اور کوئی ایک فریق صلح کی خواہش ظاہر کرے تو دوسرے کو بھی صلح کے لیے جھک جانا چاہیے۔ ان قرآنی ہدایات کی روشنی میں بہتر تو یہی ہے کہ زوجین کے مابین سمجھوتے کے لیے کسی بیرونی مدد کی ضرورت ہی نہ پڑے اور زوجین ہی صلح وصفائی سے کام لے کر جھگڑا نمٹا دیں، کیونکہ کسی بیرونی فریق کی شرکت سے بسا اوقات نجی احوال بھی اس کے علم میں آجاتے ہیں جس کے بعد گھر کی بات گھر میں نہیں رہتی، بلکہ گھر گھر کہانی بن جاتی ہے اور نہیں تو زوجین کا وقار بیرونی فریق کی نظر میں ضرور کم ہو جاتا ہے، مگر بسا اوقات اس کے بغیر چارہ کار بھی نہیں ہوتا، مثلاً قصور بیوی کا ہو اور شوہر نے اصلاح کے لیے تدریجی مراحل اختیار کر لیے ہوں یا نزاع باہمی ہو اور زوجین خود کوئی حل تلاش نہ کر سکیں تو پھر مخلص اور معاملہ فہم حضرات کے سامنے وجہِ نزاع کا ذکر کر دینا چاہیے۔

میں نیم عدالتی کارروائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ آج بھی مسلمانوں کا فتوی کے ادارے پر اعتماد ہے اور ایسے مسلمانوں کی کمی نہیں ہے جو اپنے معاملات میں غیر شرعی قوانین کے بجائے شریعت کو فیصل اور حکم بنانے پر راضی ہیں، مگر عموماً فتوی کا اجراء یکطرفہ موقف پر ہوتا ہے۔ مفتی کا منصب بھی حقائق کی چھان بین نہیں ہوتا ہے اور فتوی کا حصول بھی مصالحت کے نقطۂ نظر سے نہیں، بلکہ حق یا ناحق یا شرعی حکم کی دریافت کے لیے ہوتا ہے۔

عدالت اور فتوی کے بجائے عائلی تنازعات کے حل کے سلسلے میں بہتر حل صلح کا ہی ہے۔ دورِ عثمانی میں باقاعدہ ثالث ہوتے تھے جن کا نام ہی ''مُصلِحون'' تھا اور وہ عدالتوں سے وابستہ ہوتے تھے۔ کئی ممالک نے اس راز کو پالیا ہے اور وہاں عائلی تنازعات کے حل کے لیے تربیتی طریقے وضع کیے گئے ہیں۔ ان ممالک میں خانگی جھگڑوں کو نمٹانے کے لیے زوجین کی باقاعدہ کونسلنگ کی جاتی ہے۔ ہمارے ملک میں مختلف قوانین میں صلح اور اس سے ملتے جلتے الفاظ کا استعمال ہوا ہے، مگر اس کا قانونی مفہوم متعین نہیں کیا گیا ہے۔ عائلی قوانین مجریہ ۱۹۶۱ء میں طلاق کے بعد مصالحت کی کوششوں کا ذکر ہے، حالانکہ اس عمل کی ضرورت طلاق سے پہلے ہوتی ہے۔

اس مجوزہ بل میں مصالحت کا کوئی طریقہ کار تجویز نہیں کیا گیا ہے۔ اگر بل صرف مصالحت سے خاموش ہوتا تو زیادہ تشویشناک نہیں تھا، مگر المیہ یہ ہے کہ بل مصالحت کے اصولوں کے برعکس سفر کرتا ہے اور اس کی کوشش مصالحتی کاوشوں کو ناکام بنانے کی نظر آتی ہے۔ مصالحت کے لیے اولین شرط یہ ہے کہ فریقین اس کی ضرورت محسوس کریں، لیکن جب ستم رسیدہ پختہ شعور کا مالک نہ ہو، طبیعت خواہشات کی اسیر اور روایات واقدار کی باغی ہو، دوسری طرف جب قانون اپنی پوری قوت کے ساتھ اس کے پشت پر کھڑا ہو اور اس کا ارادہ مدعی علیہ کو نشانۂ عبرت بنانے کا ہو اور اس کے ساتھ متضرر کو آزادی، خلوت میں عدمِ مداخلت، من پسند رہائش، جرمانہ و ہرجانہ اور مالی امداد وغیرہ کے خواب دکھائے گئے ہوں تو وہ مصالحت کی ضرورت کیوں محسوس کرے؟ اور اس پر کیوں کر آمادہ ہو؟

اگر فیملی کے افراد مصالحت کی اہمیت کو جانتے ہوں اور اس کی ضرورت محسوس کرتے ہوں تو وہ باوجود خواہش کے اس میں کامیاب نہیں ہوسکتے ہیں، کیونکہ یہ بل تنازع کے ایک فریق متضرر کو اس طرح اُچک لیتا ہے اور خاندان سے اسے یوں کاٹ لیتا ہے، گویا وہ نہ کسی خاندان کا فرد ہے، نہ وہ کسی کی اولاد ہے، نہ ہی اس کا کسی سے رشتہ ناطہ ہے اور نہ ہی آئندہ کے لیے اسے خاندان یا تعلقات کی ضرورت ہے، گویا وہ کسی آسمانی سیارے سے اُترا تھا اور اب دوبارہ ہمیشہ کے لیے واپس جارہا ہے۔ اگر متضرر کو خاندان سے کاٹنا مقصد نہیں ہے تو پھر ہر نوع کا رابطہ اس سے ممنوع کیوں ہے؟ مدعی علیہ کے رشتہ داروں

کی اس سے ملاقات پر پابندی کیوں ہے؟ دونوں کے درمیان ایک مخصوص فاصلہ برقرار رکھنا کیوں ضروری ہے اور متضرر کو بجائے خاندان کے کسی سنجیدہ، برگزیدہ، عمر رسیدہ اور خیر خواہ شخصیت کے بجائے اپنے محبوب اور دوست کے ساتھ رہنے کا حق کیوں ہے؟

مصالحت اس وقت ممکن ہوتی ہے جب ٹوٹے ہوئے رابطے بحال ہوں۔ رابطوں کی بحالی سے غلط فہمیاں دور ہوتی ہیں اور فریقین ایک دوسرے کو اپنی رائے سے متفق کرنے کی کوشش کرتے ہیں، کچھ مانو اور کچھ منواؤ کی بنیاد پر بات آگے بڑھتی ہے اور ایک دوسرے سے وعدے اور یقین دہانیاں اور ضروری ہو تو ضامن یا ضمانت لے کر جھگڑا ختم کر دیا جاتا ہے، مگر جب رابطے ہی منقطع ہوں تو ایک دوسرے کو کیسے قائل کیا جا سکتا ہے؟

اگر دونوں کے ہمدرد درمیان میں آ کر تنازع کو حل کرنا چاہیں تو ثالث بھی سب سے پہلے فریقین کو مذاکرات کی میز پر لاتا ہے، مگر یہ قانون اس کی بھی گنجائش نہیں چھوڑتا ہے۔

اگرچہ اس بل کے تحت وقوع پذیر جرم کو قابل راضی نامہ قرار دیا گیا ہے، مگر بل جو میکنزم تجویز کرتا ہے، اس کے تحت راضی نامہ جو مصالحت ہی کا دوسرا نام ہے، مشکل ضرور نظر آتا ہے۔ بل سروس فراہم کنندہ اور افسرِ تحفظ وغیرہ کی صورت میں جو کردار متعارف کراتا ہے اور تھانہ، پناہ گاہ، شیلٹر ہوم وغیرہ کی صورت میں جن اداروں کو پیش کرتا ہے۔ وہ سب اجنبی لوگ، اجنبی ماحول اور اجنبی جگہیں ہیں، جب کہ مصالحت میں وقت اور مقام کی پابندی نہیں ہوتی، اجنبی لوگ اور اجنبی ماحول نہیں ہوتا ہے، جیسا کہ ذکر ہوا کہ میاں بیوی کے درمیان اختلاف کے وقت قرآن کریم ان کو حکم دیتا ہے کہ اپنی اپنی طرف سے ایک ایک ثالث کا انتخاب کریں اور ثالث ان کے رشتہ داروں میں سے ہوں۔ اگر ثالثان کی خواہش مصالحت کی ہوگی تو اللہ پاک بھی زوجین کے درمیان موافقت پیدا فرما دیں گے۔ جو ہمدردی اور خلوص ایک رشتہ دار دوسرے رشتہ دار کے لیے رکھتا ہے، باوجود کوشش کے ایک اجنبی وہ جذبات اپنے دل میں پیدا نہیں کر سکتا ہے۔ ثالث جب رشتہ داروں میں سے ہوتا ہے تو مصالحت کی کامیابی کے امکانات بہت بڑھ جاتے ہیں، کیونکہ مصالحت کی کامیابی کے لیے درست معلومات کا حصول شرط ہے۔ خاندان کا ممبر ہونے کی حیثیت سے ثالث درست حقائق سے واقف ہوتا ہے اور اگر وہ واقف نہ بھی ہو تو دیگر رشتہ داروں کے ذریعے اس کے لیے درست معلومات تک رسائی آسان ہوتی ہے۔ نجی احوال کے متعلق بھی خاندان کے رکن سے تو کھل کر گفتگو ہو سکتی ہے، مگر اجنبی لوگوں کے سامنے ایسا ممکن نہیں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ خاندان کا فرد ہونے کی حیثیت سے وہ فریقین کی ثقافت، رسم و رواج، کردار، خاندان کے حالات، اور ان کے مزاج سے واقفیت رکھتا ہے۔ وہ طویل نشستوں میں فریقین کا ذہن پڑھ لیتا ہے اور ان کو ایک

درمیانی راستے تک لانے میں کامیاب ہوجاتا ہے، وہ اس مقصد کے لیے دیگر اقارب کی بھی مدد لے سکتا ہے اور فریقین پر اثر ورسوخ رکھنے والی شخصیات کو استعمال کرلیتا ہے، مگر ایک سرکاری افسر کے لیے یہ سب کچھ ممکن نہیں ہوتا ہے۔ ان امور کی وجہ سے ثالث محض رسمی کارروائی انجام نہیں دیتا، بلکہ اس کی شدید خواہش فریقین میں مصالحت کی ہوتی ہے اور اگر مصالحت کے بجائے کوئی اور فیصلہ کرتا ہے تو تمام حقائق کے جائزے کے بعد وہی فریقین کے حق میں مفید ہوتا ہے۔

تادیبِ اولاد

تادیب کا حق جس طرح شوہر کو حاصل ہے، اسی طرح والدین کو بھی حاصل ہے۔ والدین کو یہ حق اس وجہ سے حاصل ہے کہ ان پر اولاد کی تربیت کی بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ تربیت بظاہر ایک سادہ سا لفظ ہے اور روزمرہ کی گفتگو میں زبانوں پر بار بار آتا ہے، اس کثرتِ استعمال کی وجہ سے اس کی وسعت اور اہمیت کی طرف نظر نہیں جاتی، حالانکہ یہ لفظ اپنے اندر بہت گہری حقیقت رکھتا ہے۔ یہ لفظ تین بنیادی ذمہ داریوں کی نشان دہی کرتا ہے:

❶: پرورش ونگہداشت، جس کا تعلق جسمانی ضروریات سے ہے۔ فقہ میں اس مقصد کے لیے نان ونفقہ، رضاعت اور حضانت کے ابواب قائم کیے گئے ہیں۔

❷: تعلیم، اس میں دینی ودنیوی حقوق اور ذمہ داریوں کی تعلیم شامل ہے۔

❸: درست شخصیت کی تعمیر، اس کو تزکیۂ نفس سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں۔

ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے شریعت والدین کو تادیب کا حق دیتی ہے، جس سے مراد تنبیہ اور سرزنش ہے اور آخری چارہ کار کے طور پر اس میں مناسب جسمانی سزا بھی شامل ہے۔

تادیب کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب تعلیم وتربیت کے تقاضوں میں کوئی خلل آتا ہے، مثلاً اولاد تعلیم میں سستی کرے یا غفلت برتے جس سے شخصیت کا ظاہر بگڑتا ہے یا معصیت کا مرتکب ہو، بری صحبت میں بیٹھتا ہو یا چوری کرتا ہو جو باطن کے بگاڑ، بدسیرتی اور بدخلقی کی علامت ہے تو تادیب واجب ہوجاتی ہے۔ تادیب چونکہ غلطی کی اصلاح کے لیے ہوتی ہے، اس لیے شریعت اپنے عام مزاج کے مطابق تدریج کے اصول کو بروئے کار لاتی ہے، اس لیے پہلے پہل غلطی کی نشاندہی کرکے سمجھایا بجھایا جاتا ہے اور فوائد ونقصانات سے آگاہ کیا جاتا ہے، بلکہ اگر مصلحت چشم پوشی سے کام لینے کی ہو تو غلطی سے صرف نظر کرلیا جاتا ہے، پھر ڈرانے دھمکانے سے کام لیا جاتا ہے اور اگر یہ حربہ بھی کارگر ثابت نہ ہو تو سختی اور درشتی سے کام لیا جاتا ہے اور ان سب کی ناکامی کے بعد حسب ضرورت ومصلحت جسمانی سزا دی جاتی ہے۔

اگرچہ اولاد کی تادیب جائز ہے، مگر تادیب کے طور پر جسمانی سزا کی اجازت اس وقت ہے،

جب بچے کی عمر سات سال یا اس سے زیادہ ہو، کیونکہ اس سے پہلے ناسمجھی کا زمانہ ہوتا ہے۔ جب بچے کا شعور کچھ پختہ ہو جائے، مگر مکمل پختہ نہ ہو جسے صبی ممیز کہا جاتا ہے تو پھر اس کی تادیب جائز ہے۔ اس حالت کا زمانہ سات سے بلوغت تک رہتا ہے۔ اس مدت میں اگرچہ بچے کی تادیب جائز ہے، مگر اس کا کوئی فعل یا ترکِ فعل خواہ کتنا ہی سنگین کیوں نہ ہو، وہ جرم نہیں ہے اور اس پر فوج داری سزا کا اجراء ناجائز ہے۔ بلوغت کے بعد بچے کا فعل جرم بن جاتا ہے اور اس کو فوج داری سزا دینا بھی جائز ہو جاتا ہے۔

اولاد کے متعلق تادیب کا حق اس پہلو سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ شوہر کو تادیب (ضرب) کا حق ہے، مگر اس پر تادیب کا وجوب نہیں ہے، لیکن اولاد کی تادیب واجب ہے، کیونکہ ان کی تادیب سے مقصود ان کی تعلیم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان معاشرہ روزِ اول سے لے کر آج تک اس کو ایک لازمی ذمہ داری سمجھتا چلا آرہا ہے، گویا یہ ایک مسلمہ روایتی قدر ہے جس کو ممنوع قرار دینا خود جرم تو ہوسکتا ہے، مگر جائز قانون نہیں ہوسکتا ہے۔

یہ بل حقِ تادیب کے اس طور پر خلاف ہے کہ تادیب میں وعظ ونصیحت اور پھر تخویف وتہدید بھی شامل ہے، مگر اس بل کی شقوں کا سہارا لے کر اولاد عدالت پہنچ سکتی ہے کہ انہیں گھریلو تشدد کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔